[illegible]

[illegible]

# [illegible]

([illegible])

(۴۳)

# فقہِ ابن تیمیہؒ

عقائدِ اسلامیہ اور ان کے دفاع کے متعلق امام ابن تیمیہؒ کے افکار و خیالات، اور محاربات و مجادلات سے ان کے علم وسیع، فکرِ عمیق اور دقیقہ رسی کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن ان چیزوں کی جدت و ندرت صرف امام صاحبؒ ہی کی ذات سے وابستہ نہیں تھی ——— سوا زیارتِ روضۂ شریفہ اور استغاثہ بہ حضرت محمدیہ کے[1] ——— لیکن فقہ میں وہ اختیاراتِ مستقلہ کے حامل ہیں، وہ مذاہب اربعہ میں سے کسی کے خاص طور پر تابع نظر نہیں آتے اور کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ ان کا مسلک چاروں مذاہب سے الگ اور جدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہم ان کے استقلالِ فکر پر متوجہ ہوتے ہیں، اگرچہ وہ منہاجِ احمد بن حنبلؒ سے پورے طور پر جدا نہیں نظر آتے۔

وصفِ مذہبی

ابن تیمیہؒ نے سب سے پہلے فقہ حنبلی کا درس لیا، فقہ حنبلی کی تعلیم انہوں نے اپنے والد سے حاصل کی، ان کا سارا خاندان حنبلی تھا، انہوں نے اس کتاب[2] میں بھی عملی حصہ لیا، جس کی تصنیف ان کے دادا نے شروع کی تھی، پھر ان کے والد نے اسے جاری رکھا، آخر ابن تیمیہؒ نے اسے اتمام تک پہنچایا۔ وہ فقہ حنبلی کی ایک مایۂ ناز کتاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر علماء انہیں خالص حنبلی قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ حنابلہ کا دفاع کرتے ہیں، اگرچہ حنابلہ ان کے مخاصمات میں شریک نہیں ہیں، نیز اس لیے کہ امام صاحبؒ کی محققانہ آرا فقہ حنبلی کی اصل سے مشتق

---

[1] ان دونوں میں بھی امام صاحبؒ متفرد نہیں تھے، انہوں نے مسالکِ سلف کی تجدید کی تھی، اپنے تعدد کے ذوق کے مطابق ان کو منقح کرنے میں بے شک منفرد تھے۔ (ع، ح)

[2] یعنی مسودۃ فی الاصول جس کا ذکر آگے آئے گا (ع ح)

ہیں، گو ان کی انتہا بعض مسائل میں حنبلی مذہب سے اختلاف پر ہوتی ہے، اور وہ مذاہبِ اربعہ سے ہٹ کر کسی ایک مسلک کو پسند کر لیتے ہیں، بلکہ کبھی چاروں سے جداگانہ مسلک اختیار کر لیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود فقہائے حنابلہ کی اکثریت نے ان کو حنبلیت سے خارج نہیں سمجھا۔ اس لیے امام صاحبؒ اپنی انفرادیت کے باوجود مذہبِ حنبلی کی اصل کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

امام صاحبؒ کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہمیشہ فقہ حنبلی ہی کے حلقہ بگوش نہیں رہتے تھے، دوسرے فقہی مذاہب کا مطالعہ بھی کرتے رہتے تھے، جیسے ابن قدامہ کی "مغنی" اور ابن حزمؒ کی "محلی"۔ انہوں نے شیعۂ امامیہ کی فقہ کا بھی بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ان کی کتاب "منہاج السنۃ" ہمارے اس دعوے کا ثبوت ہے، اس کتاب میں شیعوں سے مجادلہ کیا گیا ہے اور امامت سے متعلق ان کے عقائد پر بڑی گہری نظر ڈالی گئی ہے۔ عقائد کے ساتھ ساتھ ان کی فقہ کا مطالعہ بھی لابدی تھا، چنانچہ طلاق ثلاث بلفظ ثلاث اور تعلیق طلاق سے متعلق ان کی رائے شیعوں کی فقہی آراء سے بہت قریب ہے، اگرچہ پورے طور پر ان سے متحد نہیں[1]۔ اس مسئلہ پر آگے چل کر ہم بحث و گفتگو کریں گے۔

**حنبلی مذہب سے متعلق امام صاحبؒ کی رائے**

مذاہبِ فقہی کے قیود سے آزاد رہنے کے باوجود وہ امام احمدؒ کے مذہب کو دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں سنت سے قریب تر سمجھتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں:

"دوسرے ائمۂ فقہ کے مقابلہ میں امام احمدؒ کتاب و سنت اور اقوالِ صحابہ و تابعین کے زیادہ رمز شناس تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں نص کے خلاف کوئی بات نہیں ملے گی اور اس کے برعکس دوسروں کے ہاں مل جائے گی۔ اگر احمدؒ کے مذہب میں کوئی قول ضعیف نظر آتا ہو تو دوسرا قول ایسا بھی ہوگا جو با دلیل قول کے موافق ہو اور ان کے اکثر مفاریدِ (جن امور میں وہ منفرد ہیں) اسی پر مبنی ہیں۔ جیسے سفر میں وصیت کے سلسلہ میں مسلمان کے خلاف اہلِ ذمہ کی شہادت کا قبول کر لینا یا نکاح زانیہ کی حرمت جب تک وہ توبہ نہ کرے یا غلام کی شہادت کا جواز، بعض ایسے مسائل ہیں جن میں امام احمدؒ کو بعض لوگ منفرد سمجھتے ہیں، حالانکہ ان میں ان کا انفراد امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ سے تو ہے، لیکن حضرت

---

[1] لیکن ہم آئندہ کسی حاشیے میں لکھیں گے کہ طلاق ثلاثہ کے مسئلہ میں ان کا مسلک صحیح مسلم اور مسند احمد وغیرہ کی صحیح حدیثوں پر مبنی ہے، شیعہ فقہ کا اس پر کوئی اثر نہیں۔ واللہ اعلم۔ (ع۔ ح)

امام مالکؒ کا قول ان کے موافق ہے یا ان کے قریب۔ پھر ایسے مسائل عام طور پر دلیل سے مزین ہوتے ہیں۔ مثلاً ان حیلوں کا ابطال جو زکوٰۃ اور شفعہ کو ساقط کرنے کے لیے گھڑے گئے ہیں۔ یا وہ حیلے جو سُود اور فواحش کو جائز کر دیں، نیز عقود میں مقصد اور نیت کا اعتبار اور شروط میں عرف کا اعتبار اور شرطِ عرفی اور شرطِ لفظی کی یکسانیت اور عقودِ مطلقہ میں لوگوں کے عرف پر اکتفا یعنی عام طور پر لوگ جسے بیع مانیں وہ بیع ہے، جسے اجارہ قرار دیں وہ اجارہ (ٹھیکہ) ہے، جسے ہبہ تسلیم کریں وہ ہبہ ہے، جسے وقف کہیں وہ وقف ہے۔ ان معاملات میں کسی لفظِ معیّن کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، صرف عام لوگوں کا عرف کافی ہے[1]!"

**قہ حنبلی کی خصوصیت**

مذکورہ عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن تیمیہؒ، امام احمدؒ کے مذہب کو دوسرے فقہی مذاہب پر ترجیح دیتے ہیں، اس لیے کہ وہ نص سے قریب تر ہے اور جب وہ کسی دوسرے کے قول کو ترجیح دیتے نظر آتے ہیں تو تلاش و تفحص کے بعد یقیناً مذہبِ احمدؒ میں کوئی ایسا قول مل جاتے گا جو قولِ راجح کے موافق ہوگا، اس یں کوئی ایسا قول کبھی نہیں ملے گا، جو حدیث یا اثر کے خلاف ہو، اور جو قول احمدؒ کے ساتھ مالکؒ کا بھی ہو، وہ دوسروں کے اقوال کے مقابلہ میں ارجح ہوگا!

**موافقاتِ مالکؒ کی کثرت**

واقعہ یہ ہے کہ امام احمدؒ کے مذہب میں اقوال کی کثرت اور اس کا آثار سے مستند ہونا اسے مخالفِ نص نہیں ثابت ہونے دیتا اس کی ایک معاون یہ بات بھی ہوگئی کہ امام احمدؒ سنت کے بہت بڑے عالم اور جامع تھے، پھر ان کی عادت یہ تھی کہ ان کو جب کوئی ضعیف اثر بھی (بشرطیکہ صاف کذب نہ ہو) نہ مل سکتا تو ان فتاوی کو بھی جو فقہاءِ حدیث، جیسے سفیان بن عیینہؒ، سفیان ثوریؒ، اور مالکؒ سے منقول ہوں قبول کر لیا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ مذہبِ احمدؒ میں موافقاتِ امام مالکؒ کی کثرت ہے، اور جب تک شدید ضرورت نہ لاحق ہو، وہ قیاس کی طرف رُخ بھی نہیں کرتے تھے!

**نبلی مذہب میں اقوال کی کثرت**

اور امام احمدؒ کے مذہب میں جو اقوال کی کثرت نظر آتی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ تمسک بالسنۃ کے شعار پر عامل تھے اور اس سے ڈرتے تھے کہ قیاس کی بنیاد پر فتوے دیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ فتویٰ دے دیتے، پھر اس کے برخلاف کوئی حدیث نظر آجاتی، تو مقتضائے حدیث کے مطابق فتوے دیتے اور

---

[1] الفتاوی ص ۱۹۹۔۲۰۰ ج ۲

اپنے پہلے قول کو واپس لے لیتے، لیکن روایت دونوں کی کرتے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ میں امام احمدؒ سے دو قول منقول ہوتے ہیں لیکن ایسا اس وقت کرتے، جب صحابہ کو مختلف الرائے پاتے اور کوئی ایسی حدیث نہ پاتے جو دونوں میں سے کسی ایک رائے کو ترجیح دے سکتی ہو، لہٰذا ایسے مسئلہ میں دونوں آرا کا ذکر کرکے بات وہیں چھوڑ دیتے تھے[1]

ابن تیمیہؒ کو اس اختلاف اور کثرتِ اقوال سے بڑی مدد ملی، کیونکہ انہوں نے محسوس کیا کہ مذہب احمدؒ شذوذ پر مبنی نہیں ہے، کیونکہ اگر اس میں قول مرجوح ہے تو قول راجح بھی موجود ہے۔ یہ ایسی خصوصیت تھی جسے ابن تیمیہؒ بہت پسند کرتے تھے۔ اسی روزن سے نور کی وہ شعاعیں ان تک پہنچیں، جن کی روشنی میں فقہِ صحابہؓ اور فقہ تابعینؒ کا استیعاب کے ساتھ مطالعہ آسان ہو گیا، اور ایسا دروازہ وا ہو گیا جس نے ایسی شاہراہ پہ پہنچا دیا جس پر چل کر وہ فقہ اسلامی کی عمیق لیکن واضح تحقیق کرنے کے قابل ہو گئے۔!

**حنبلی مذہب کی وجہ فضیلت**

بلاشبہ امام ابن تیمیہؒ بڑی حد تک حنبلی مذہب کے پیرو تھے، جملہ مذاہبِ اربعہ سے وہ حنبلیت کو افضل مانتے تھے، اپنے استنباط میں اس کے اصول کی پوری پوری پابندی کرتے تھے، ان کے نزدیک مذہبِ حنبلی مذاہبِ اسلامیہ میں سب سے بہتر تھا، کیونکہ اس میں انہیں وہ شادابی نظر آتی تھی، جو دوسرے مذاہب میں نہیں ملتی تھی، خصوصاً عقود و شروط میں عرفِ عوام کا احترام، بشرطیکہ نص ان کی مخالف نہ ہو اور دلیلِ شارع سے مخالفت نہ ثابت ہو۔

**تقلیدِ مذہبی سے بلند تھے**

لیکن اس کے باوجود وہ ان لوگوں میں نہیں تھے جو یہ سمجھتے ہیں کہ حق صرف انہی کے مذہب میں مرکوز ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ ائمہ فقہ میں سے ہر ایک کو حق کا جویا اور مخلص سمجھتے تھے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے تین امور قرار دیتے ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ تعصب مذہبی کی طرف مائل نہیں تھے، اور مذہبِ حنبلی کو اگر دوسرے فقہی مذاہب پر ترجیح دیتے تھے تو تعصب کے سبب نہیں، بلکہ اس لیے کہ اس میں سب سے زیادہ سلف کا رنگ رچا ہوا نظر آتا تھا۔ بہر حال امام صاحبؒ کے وہ امورِ ثلاثہ یہ ہیں:

---

[1] اعلام الموقعین ص ۲۵ ج ۱

(۱) ائمۂ اربعہ کی وہ پوری پوری قدر و منزلت کرتے تھے۔

(۲) وہ ہر محقق کو یہ وصیت کرتے ہیں کہ کسی ایک خاص مذہب کا التزام نہ کرلے، بلکہ حق جہاں پاتے لے لے۔

(۳) تمام مذاہبِ فقہی کی پیروی ترک کردی جاتے، اگر کوئی حدیث ان کی مخالف نظر آتے۔

ان امورِ ثلاثہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ فقیہ مجتہد تھے۔

**ائمۂ فقہ کا احترام**

ائمۂ فقہ کا ابن تیمیہؒ کتنا احترام کرتے تھے؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ ان بزرگوں کے سب اقوال و آراء کو تحقیقِ مسائل کے وقت سامنے رکھتے اور نہایت دیدہ وری، غیر جانبداری اور کھلے دل سے ان کا موازنہ کرتے ہیں، خطاء و صواب کی خوب چھان بین کے بعد عمل کے لیے سب سے بہتر قول اختیار فرماتے ہیں لیکن مخالفِ صواب قول کے قائلین کی طرف سے نہایت احترام سے عذر بیان کر دیتے ہیں۔ انہوں نے اس بارے میں ایک مستقل رسالہ بھی لکھا ہے، جس کا نام ہے "رفع الملام عن الائمۃ الاعلام"۔ اس رسالے میں انہوں نے مخالفِ احادیث اقوال کے مختلف اسباب ذکر کیے ہیں، جس کی ابتدائی سطور یہ ہیں:

"اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حسبِ ارشادِ قرآنِ کریم ایمان والوں سے موالات و محبت ضروری ہے، خصوصاً علماءِ کرام سے کہ وہ انبیاء کے وارث، ظلمت کدۂ دنیا میں روشنی کے مینار اور نجومِ ہدایت ہیں۔ علماء کی ہدایت و درایت پر امت کا اجماع ہو چکا ہے، بعثتِ محمدی سے قبل علماء اشرار ہوتے تھے، ملتِ محمدیہ کے علماء خیارِ امت ہیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء ہیں۔ آپؐ کی سنتوں کو زندہ کرنے والے ہیں۔ وہ قرآن کے ساتھ قائم ہیں اور قرآن کریم ان کی مساعی کی بدولت قائم و دائم ہے۔ ان کا نطق کتاب اللہ کے ساتھ ہے، اور کتاب اللہ کا نطق ان سے وابستہ ہے۔"

اس تمہید کے بعد لکھتے ہیں:

"جاننا چاہیے کہ ائمۂ مقبولین میں سے کوئی امام بھی ایسا نہیں گزرا ہے جو عمداً کسی چھوٹے یا چھوٹے معاملہ میں سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتا ہو۔ یہ سب اتباعِ رسولؐ کے وجوب پر متفق ہیں، پس اگر کہیں یہ محسوس ہو کہ کسی امام کے قول کے خلاف حدیثِ صحیح موجود ہے تو امام مذکور نے یقیناً اس حدیث کو کسی عذر اور سبب کے باعث ترک کیا ہوگا۔"[1]

---

[1] ملاحظہ ہو، مقدمہ "رفع الملام عن الائمۃ الاعلام"

**عذرِ صحیح کی نوعیت** لیکن یہ "عذر" جس کے ماتحت حدیثِ صحیح ترک کر دی گئی ہو، کیا ہو سکتا ہے؟ امام صاحبؒ بتاتے ہیں کہ اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱) اس حدیث صحیح کا امام کو علم ہی نہیں تھا۔

(۲) علم تھا لیکن اس کی نظر میں مسئلہ کی پیش آمدہ صورت جس پر اس نے فتویٰ دیا ہے، حدیث کے عموم یا خصوص میں داخل نہیں، نہ اس کا علم کہ مفتیٰ بہ مسئلہ اس حدیث کے عموم سے مخصوص ہے

(۳) اس کا خیال ہو گا کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔

**ناواقفیت کے اسباب** اس کے بعد امام صاحبؒ بتاتے ہیں کہ بعض احادیث سے لاعلمی یا ناواقفیت کسی امام کے پایۂ فضل و کمال میں کمی نہیں کرتی، پھر بتاتے ہیں کہ اس لاعلمی اور ناواقفیت کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں!

کسی شخص واحد کے لیے تمام احادیثِ نبویہ کا احاطہ کر لینا قطعاً ناممکن ہے۔ خلفائے راشدین سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امور اور سنت کا کون رمز آشنا ہو سکتا تھا؟ خاص طور پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کہ ہمیشہ سفر اور حضر میں ساتھ رہتے تھے، وقت کا بڑا حصہ شرفِ صحبت میں صرف کرتے تھے، رات کو بڑی دیر تک آپؐ سے امورِ مسلمین پر گفتگو کیا کرتے تھے، یہی حال عمر بن الخطابؓ کا تھا؛ آں حضرتؐ ان دونوں بزرگوں کے متعلق اکثر فرمایا کرتے تھے "میں اور ابوبکرؓ و عمرؓ وہاں گئے"! "میں اور ابوبکرؓ و عمرؓ باہر نکلے"! لیکن اس کے باوجود ابوبکرؓ سے جب جدّہ کی میراث کے بارے میں سوال کیا گیا، تو فرمایا "میں تیرے لیے نہ کتاب اللہ میں کچھ پاتا ہوں، نہ سنت رسول اللہ میں، لیکن لوگوں سے (صحابہؓ سے) دریافت کروں گا۔ چنانچہ آپ نے دریافت فرمایا۔ فوراً حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور محمد بن مسلمہؓ اٹھے، اور بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جدّہ کو میراث میں چھٹا حصہ دلایا ہے"! اسی طرح حضرت عمرؓ کو نہیں معلوم تھا کہ بیوی شوہر کی دیت سے ورثہ پاتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ضحاک بن سفیانؓ کو لکھا، انہوں نے بتایا کہ رسول اللہؐ نے اشیم ضبابی کو اس کے شوہر کی دیت میں سے ورثہ دلایا تھا، چنانچہ عمرؓ نے اپنی رائے ترک کر دی، اور کہا، لولم نسمع ھذا لقضینا بخلافہ، یعنی اگر ہم نے ضحاکؓ کی یہ بات نہ سنی ہوتی، تو ہم حدیث کے خلاف کر دیتے"![1]

---

[1] رسالہ رفع الملام ص ۸۲-۸۳ - در ضمن مجموعہ رسائل کبریٰ ابن تیمیہؒ - طبع المنار

**ایک اور توجیہ** اسی طرح امر ثانی کے بارے میں یعنی کسی امام کے علم میں حدیث ہو، لیکن وہ اسے اپنے فتوے پر منطبق نہ سمجھتا ہو، فرماتے ہیں کہ حدیث مرفوع میں وارد ہوا ہے

لاطلاق ولاعتاق فی اغلاق — حالتِ اغلاق میں اگر بیوی کو طلاق دی جائے، یا

(سنن ابی داؤد) — یا غلام کو آزاد کر دیا جائے تو یہ بات نہیں مانی جائیگی

"اغلاق" کی تفسیر بعض ائمہ کے نزدیک "اکراہ" یعنی جبر ہے، لیکن جو اس کے مخالف ہیں وہ اس تفسیر کو نہیں مانتے۔

کبھی الفاظِ حدیث کو اپنے ہاں کے مروجہ معنوں پر محمول کر لیا جاتا تھا جب کہ وہ معنی عہدِ نبوی میں مستعمل نہیں تھے۔ چنانچہ احادیثِ صحیحہ کے رو سے "نبیذ" کھجوروں کے اس مشروب نقوع کو کہا جاتا تھا جس میں سکر کی کیفیت پیدا نہ ہوئی ہو، لیکن بعد میں اسی نوعیت کے بعض نشہ آور مشروبات پر اس کا اطلاق ہونے لگا تو بعض لوگوں نے غلطی سے اپنے ہاں کے عرفی معنی پر حدیث کو منطبق کر لیا۔ اس طرح "خمر" کا لفظ ہے جس کا اطلاق از روئے احادیثِ صحیحہ و صریحہ ہر نشہ آور مشروب پر ہوتا ہے لیکن بعد میں اہلِ کوفہ نے اپنے عرف کی بنا پر "خمر" کو "عصیرِ انگور" کے ساتھ خاص سمجھ لیا" (جس پر کئی دوسرے مسائل متفرع کیے گئے) اسی نوعیت کے کچھ اور وجوہ و اسباب بھی امام صاحبؒ نے گناتے ہیں جن پر ائمہ کے اختلاف کو محمول کیا جا سکتا ہے۔[1]

**بعض مزعومہ قاعدوں کی بنا پر حدیث کی مخالفت** مخالفتِ حدیث کے تیسرے سبب (یعنی یہ خیال کرنا کہ حدیث زیرِ بحث منسوخ ہے) کے بارے میں امام صاحبؒ فرماتے ہیں بعض علماء کا خیال ہوتا ہے کہ حدیث زیرِ بحث، کسی دوسری نص کے معارضہ کے باعث مؤول یا منسوخ ہے۔ مثلاً کوفہ کے بہت سے فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ وہ نصِ حدیث پر ظاہرِ قرآن کو ترجیح دیتے ہیں۔ پھر کبھی غیر ظاہر کو ظاہر سمجھ لیتے ہیں اور اسی بنا پر مدعی کے ساتھ (دوسرا گواہ نہ ہونے کی صورت میں) ایک گواہ اور مدعی کی قسم کو حدیث کے باوجود قبول نہیں کرتے، لیکن دوسرے لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ظاہرِ قرآن میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو ایک شاہد اور دوسرے شاہد کی عدم موجودگی میں مدعی کی قسم والی حدیث کو مانع ہو۔ اسی طرح مالکی فقہاء کے ایک طبقہ نے بعض احادیث کو عملِ اہلِ مدینہ کے مخالف خیال

---

[1] رسالہ رفع الملام ص ۸۹ - ۹۰

کر کے ترک کر دیا یا ان کی کوئی تاویل کر لی، حالانکہ خود اہلِ مدینہ کا بھی اختلاف اس مسئلہ میں اکثر اہلِ علم سے منقول ہوتا ہے، لیکن اگر اہلِ مدینہ کا کسی مسئلہ پر اجماع بھی ہو جاتے تو دلیلِ شرعی حدیث کو قرار دینا چاہیے نہ کہ کسی کے عمل کو۔

امام ابن تیمیہؒ نے اس سلسلہ کی ایک اور مثال بعض فقہائے کوفہ وغیرہ کی دی ہے کہ واضح اور جلی قیاس کے مقابلے میں خبرِ واحد کو ترک کر دیتے ہیں۔[1]

## اجتہادی فروگذاشتیں شریعت کی نظر میں

سطورِ بالا سے اندازہ ہو گیا کہ امام صاحبؒ جو خود ایک بہت بڑے فقیہ تھے، فقہا اور ائمۂ اعلام کی قدر و منزلت میں کسی سے پیچھے نہیں تھے، بلکہ ان سے اگر کوئی لغزش نظر آتی تھی تو حتی الامکان اس کی توجیہ و تاویل کرتے تھے، انہوں نے وضاحت کی ہے کہ یہ ائمہ اپنی اجتہادی فروگذاشتوں میں جزا اور ثواب کے مستحق ہیں، اس لیے کہ یہ مخلص تھے، مجتہد تھے، اٹکل پچو باتیں پیدا نہیں کرتے تھے اور مجتہد کا اجتہاد اگر صحیح ہو تو اسے دو اجر ملتے ہیں اور اگر غلط ہو تو (محنت کا) ایک اجر ملتا ہے، کیونکہ اگر مجتہد کا اجتہادی غلطی میں احتساب کیا جاتے اور اسے سزا دی جاتے تو یہ تنگی اور تکلیف کی بات ہے، کیونکہ پھر لغزش کے اندیشہ اور عقاب کے ڈر سے کوئی شخص بھی اجتہاد کی طرف راغب نہیں ہوگا اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اگر ادواتِ فہم موجود ہوں تو مجتہد کو اس کے غلط اجتہاد پر ملامت نہیں کی، نہ اس کے لیے کوئی سزا تجویز کی یہی وجہ تھی کہ جب اسامہ بن زیدؓ نے ایک غزوہ میں لا الہ الا اللہ کا کلمہ پڑھ لینے کے باوجود جان بچانے کی ترکیب سمجھ کر ایک شخص کو ہلاک کر دیا[2] تو آں حضرتؐ نے نہ اسامہؓ کو سزا دی، نہ ان پر دیت، قصاص اور کفارہ واجب کیا، کیونکہ وہ اس کے جواز کے (اپنے اجتہاد سے) قائل تھے، امام صاحبؒ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

"جمہور فقہا کا اس پر اتفاق ہے کہ اہلِ عدل کے ہاتھوں کسی تاویل کے ماتحت اگر کسی باغی کا قتل ہو جائے تو دیت، کفارہ اور تاوان لازم نہیں آئے گا، اگرچہ اس سے قتل و قتال حرام ہو۔"[3]

غرض امام صاحبؒ فروعی اختلافات میں تسامح سے کام لیتے ہیں بشرطیکہ ادواتِ اجتہاد موجود ہوں، البتہ عقائد کے اختلاف میں تسامح نہیں برتتے، چنانچہ مخالفتِ عقاید صحیحہ کو کبھی بدعت کبھی گمراہی

---

[1] رسالہ رفع الملام ص ۹۳ [2] صحیح بخاری باب بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم اسامۃ بن زید الخ (ع-ح)
[3] رفع الملام ص ۹۵-۹۶۔

بلکہ کبھی کفر بھی کہہ دیتے ہیں۔ دراصل عقیدہ کے باب میں ان کے نزدیک لچک کی گنجائش نہیں، اسی طرح اصول فرائض اسلام میں کسی طرح کا اختلاف برداشت نہیں کرتے، اس لیے کہ یہ دونوں دین کا جوہر اور اس کا لب لباب ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ عقائد کے جزئی اختلافات کو دین کا جوہر نہیں قرار دیا جا سکتا، وہ عام طور پر لفظی اختلاف ہیں[1]۔

**غلطی کی پیروی ہرگز نہ کی جائے**

یہ تو صحیح ہے کہ امام صاحبؒ ان ائمہ کی پوری پوری قدر کرتے تھے، جن کے فضل و اجتہاد کی ملت اسلامیہ قائل ہے اور مذہب حنبلی کو اس کے قریب بہ سنت نبوی ہونے کے باعث خاص طور پر افضل مانتے تھے، لیکن شرح شریف کا جو حق ان کی نظر میں تھا اس نے انہیں ماسوا سے بیگانہ کر دیا تھا۔ وہ اس کے قائل نہیں تھے کہ کوئی شخص کسی فقہی مذہب سے اس وقت بھی وابستہ رہے، جب اس پر یہ امر واشگاف ہو جائے کہ حق کہیں اور ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ حق کی پیروی کرے، تعصب سے کام نہ لے، کیونکہ ہر شخص کا، خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، قول لیا اور ترک کیا جا سکتا ہے، سوا سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے، لہٰذا طالب حق کے لیے کسی خاص فقہی مذہب کا التزام جائز نہیں، جب اس کو دوسرے کسی مذہب میں بادلیل مسئلہ مل جاتا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

"یہ تو ظاہر ہے کہ عہد طفولیت میں انسان اپنے ماں باپ، قوم اور گرد و پیش کے دین و مذہب پر ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ جب عقل و شعور کی دولت سے مالا مال کرے، اس وقت اس کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کا التزام کرنا چاہیے۔ جہاں بھی اس کا سراغ ملے اور

---

[1] بعض ذیلی اختلافات کو لفظی کہا جا سکتا ہے، لیکن صحیح بخاری کی کتاب الرد علی الجہمیہ اور امام بخاری کی خلق افعال العباد، تصانیف امام احمدؒ، امام مروزی اور تصانیف امام ابن تیمیہؒ و حافظ ابن القیمؒ وغیرہم محدثین و محققین کا جس شخص نے غور و فکر سے مطالعہ کیا ہے وہ کیسے عقائد کے اختلاف کو لفظی کہہ کر ان کی جوہری اہمیت کو کم کر سکتا ہے۔

تاہم امام ابن تیمیہؒ عقائد و کلام میں تحقیق کرنے والوں کو بھی فقہی مجتہدین کی طرح مانتے ہیں کہ اجتہاد کے معیار پر پورا اترنے والے محقق کو صواب کی صورت میں دو اجر اور اگر خطاء کا صدور ہو جائے تو ایک اجر بہر حال مل جاتا ہے۔ وہ بعض دوسرے لوگوں کی طرح اس بارے میں اصول (عقائد) و فروع (فقہ) کے فرق کے قائل نہیں، یہ بحث ان کی متعدد کتابوں میں ملتی ہے مثلاً منہاج ۱/۲۴۰ اگر "تسامح" اور لچک سے مصنف کا مطلب یہ ہے تو امام صاحب کے کلام میں یہ موجود ہے۔ واللہ اعلم۔ (ع، ح)

خود کو ان لوگوں کے زمرے میں داخل ہونے سے بچاتے جن کے بارے میں قرآن حکیم میں فرمایا ہے اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا (البقرہ: ع ۲)
بنا بریں جو کوئی شخص آبائی اور قومی عادات و رسوم کی طرف مائل ہو کر قرآن و حدیث کا حکم، اور خدا و رسولؐ کی اطاعت چھوڑ دیتا ہے وہ اہلِ جاہلیت سے ہے اسی طرح وہ شخص بھی قابلِ مذمت و عقاب ہے جو کسی مسئلہ میں حق واضح ہونے پر بھی معاشرے کی عادات پر جما رہتا ہے۔[1]"

## ایک نہایت اہم سوال

لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، یہ کہ آیا ہر شخص کو یہ اختیار ہے کہ اگر حق کہیں اور دیکھے تو جس مذہب کی تقلید کرتا آیا ہے اسے چھوڑ دے؟ اگرچہ اس شخص کی حیثیت اہلِ نظر اور اہلِ استدلال کی نہ ہو؟ یا جس مذہب کی تقلید کرتا آیا ہے اسے محض ازراہِ ہوا و ہوس چھوڑ دے یہ جائز ہے؟

اس مسئلہ کی نسبت سے امام صاحبؒ نے لوگوں کی تین قسمیں کی ہیں:

## حق کے سوا کسی کی پیروی درست نہیں

پہلی قسم ان لوگوں پر مشتمل ہے جو کسی خاص فقہی مذہب کے پیرو تو ہیں، لیکن ان کا رجحان اپنے مذہب کے خلاف دوسرے قول کی طرف ہے اور وہ ادلۂ تفصیلیہ کے بھی محرم ہیں اور راجح و مرجح کا ادراک بھی رکھتے ہیں، اور مختلف قولوں میں موازنہ کرنے کی صلاحیت بھی ان میں ہے، نص اور قیاس کی روشنی میں معرفتِ احکام کی استعداد بھی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر واجب ہے کہ دین کے معاملہ میں حق کے سوا کسی اور کی پیروی نہ کریں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (النساء: ع ۹)

"تیرے رب کی قسم! یہ لوگ ایمان والے نہیں ہوں گے جب تک کہ اپنے اختلافات میں آپ کو حَکَم نہ مان لیں، پھر آپ جو فیصلہ دے دیں اس کو خوشدلی کے ساتھ تسلیم نہ کر لیں۔"

نیز فرمایا:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (الاحزاب: ع ۵)

"کسی مومن یا مومنہ کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ جب خدا و رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو وہ اپنے معاملہ میں اختیار سے کام لے۔"

---

[1] فتاویٰ ص ۲۴۷ ج ۲

لہٰذا جب یہ ثابت ہوجائے کہ جس مذہب کی وہ اب تک پیروی کرتا رہا ہے، حق اس کے علاوہ دوسرے مذہب میں ہے تو ضروری ہے کہ جس مذہب میں حق نظر آرہا ہے اس کی پیروی کرے۔[1]

ابن تیمیہؒ کے نزدیک جو شخص مسائلِ دین میں استدلال پر قادر ہو اس کے لیے تقلید جائز نہیں، اسی طرح اگر کسی خاص مسئلہ میں وہ استدلال کی قدرت رکھتا ہو تو بھی اس مسئلہ کی حد تک اسے تقلید نہیں کرنی چاہیے۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے مروی ہے :

"اگر ایسا شخص تقلید کرے گا تو گناہ گار ہوگا۔"

امام صاحبؒ یہ بھی بتاتے ہیں کہ امام شافعیؒ، ان کے اصحاب اور سفیان ثوریؒ کا بھی یہی مسلک تھا۔

**عامی کا منصب**

دوسری قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جو استنباطِ مسائل کی قدرت سے محروم ہیں۔ ایسے لوگوں کو مناسب ہے کہ براہِ راست دلیل کی بجائے کسی مردِ صالح اور مجتہد سے مسائل دریافت کریں۔ امام صاحبؒ کہتے ہیں :

"بہت سے احکام ایسے ہیں جن سے لوگ ناواقف ہوتے ہیں، لہٰذا ایسے اصحاب کے پاس پہنچتے ہیں جو ان مسائل سے واقف ہوں۔ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اور آپؐ کی مراد کا خوب علم ہوتا ہے۔ کیونکہ ائمۂ حدیث و فقہ ہی لوگوں کے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان واسطۂ تبلیغ، ذریعۂ دلائل و احکام اور فقہ و استنباط ہیں۔ یہی اپنے اجتہاد اور استطاعت کے مطابق مسائل پہنچاتے اور سمجھاتے ہیں۔"[2]

اور اس طرح کے عوام، جو استنباط کی قدرت سے محروم ہوتے ہیں، ہر زمانہ میں رہے ہیں۔ اس لیے امام شافعیؒ نے علم کی دو قسمیں کی ہیں :

۱۔ علمِ عوام

۲۔ علمِ خواص

علمِ عوام سے مراد عقیدہ اور اصول فرائض ہیں اور علمِ خواص اس سے ما وراء ہے۔ مثلاً ناسخ و منسوخ کا علم، محکم اور مؤوّل کا علم، نص اور ظاہر کا علم، عام اور خاص کا علم، نیز شرع شریف سے ایسے ہی دوسرے مسائل کا استنباط، لہٰذا ان چیزوں کا علم خواص کے سوا کسی اور کو نہیں ہو سکتا، لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ پہلا علم فرضِ عین ہے اور دوسرا فرضِ کفایہ۔

---

[1] یہ خلاصہ ہے "الفتاویٰ" ص ۲۴۳ ج ۲ کا [2] فتاویٰ ابن تیمیہؒ ص ۲۰۲ ج ۲۔

پس صورتِ مسئلہ یہ ہے کہ عامی اصولِ استنباط سے ناواقف ہوتا ہے، اور طریقِ استدلال نہیں جانتا، لہٰذا اسے دلیل کے بجائے رجال کی پیروی کرنا چاہیے[1]، اور اس کا مذہب درحقیقت وہی ہے جو اس کے مفتی کا مذہب ہے، وہ ایک راستے سے دوسرے راستے کی طرف اگر منتقل ہوتا ہے تو دوسرے کے تابع ہو کر ہی ہوتا ہے۔ اس بارے میں امام صاحبؒ کی تصریح یہ ہے:

"اگر کسی شخص کو محسوس ہو کہ کسی مسئلہ میں ایک قول دوسرے سے راجح ہے تو اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ تفصیلی دلائل کے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچے گا اور یا یہ سمجھ کر ایک قول کا قائل دوسرے کے مقابلہ میں اس مسئلہ کا زیادہ عالم یا زیادہ متقی ہے تو دوسری صورت میں اس کو چاہیے کہ زیادہ عالم یا زیادہ متقی کی پیروی کرے یہ نہ صرف جائز ہے بلکہ واجب ہے، امام احمدؒ یہی فرماتے ہیں[2]۔"

اس سلسلے میں ایک مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ آیا عامی شخص پر کسی ایک مذہب معیّن کی پابندی ضروری ہے؟ امام صاحبؒ اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"مسئلہ دراصل یہ ہے کہ عامی کے لیے آیا ضروری ہے کہ ایک مذہب معیّن کا التزام کرے کہ اس کی عزیمتیں اور رخصتوں (یعنی سہولتوں) کو پورا پورا مانے؟ اصحابِ احمدؒ و اصحابِ شافعیؒ کے اس بارے میں دو قول ہیں۔ لیکن دونوں مذہبوں کے اکثر علماء اس التزام کو واجب نہیں ٹھہراتے ہیں[3]۔ البتہ واجب کہنے والے (تھوڑے لوگ) یہ کہتے ہیں کہ کسی نے اگر التزام کر ہی لیا ہے تو اس کے لیے خروج مناسب نہیں[4] جب تک کہ دوسرے مذہب کے التزام کو پہلے سے بہتر نہ سمجھ لے[5]۔"

## مذہب ہوا و ہوس کے لیے نہیں بدلا جا سکتا

تیسری قسم میں وہ لوگ داخل ہیں جو ایک فقہی مذہب سے دوسرے فقہی مذہب میں بغیر کسی دلیل کے منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ ایسا کرنے والا یا تو اہلِ استدلال سے ہو گا اور اگر عامی

---

[1] یعنی براہِ راست ٹامک ٹوئیاں مارنے کی بجائے صاحبِ علم اور اہل حضرات سے بادلیل مسئلہ دریافت کرے۔ (ع-ح)

[2] الفتاویٰ، ج ۲، ص ۲۰۰ [3] اس لیے کہ اس کے وجوب پر کوئی دلیل شرعی موجود نہیں۔ (ع-ح)

[4] یعنی جب کہ یہ خروج بربنائے دلیل نہ ہو بلکہ بربنائے ہوا و ہوس ہو کہ یہ بحث اس صورت کے متعلق ہے۔ (ع-ح) [5] فتاویٰ ص ۲۰۱ ج ۲۔ (ع-ح)

ہے تو یہ انتقالِ مذہب کسی دینی مقصد کے پیشِ نظر نہ ہو، کسی غرض و مصلحت اور ہوا و ہوس کے ماتحت کیا جائے تاکہ کسی معاملہ میں آسانی اور سہولت حاصل کرے۔ ظاہر ہے یہ حرکت دین اور شریعت کے نقطۂ نگاہ سے حوصلہ افزائی کی مستحق نہیں، بلکہ ایسا طرزِ عمل مذہب اور شریعت کو کھیل بنانے کے مترادف ہے۔

ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ نے اس سے منع کیا ہے، کیونکہ کسی شخص کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ کسی بات کو واجب اور حرام سمجھتا ہو، اور پھر محض از راہِ ہوس اسے غیر واجب اور غیر حرام سمجھنے لگے، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص امام ابو حنیفہؒ کے مذہب پر پڑوسی سے حقِ شفعہ کا طالب ہو، لیکن خود اس کا پڑوسی جب اس سے اپنے لیے حقِ شفعہ کا طالب ہو تو وہ کہے یہ تو نص سے ثابت ہی نہیں یا کوئی شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ سگے بھائی یا مختلف البطن بھائی میراث میں جد کے ساتھ عصبہ مانے جائیں گے اور اسے بھی دوسروں کے ساتھ حصہ ملیگا، لیکن اگر وہ خود جد ہو اور اس کا ایک بھائی (سگا یا مختلف البطن) ہو تو کہدے، نہیں بھائیوں کو حصہ نہیں مل سکتا، کیونکہ امام ابو حنیفہؒ تو میراث میں "جد" کو "اب" یعنی باپ قرار دیتے ہیں، اور باپ تمام بھائیوں کو وراثت سے محجوب کر دیتا ہے یا کوئی شخص شطرنج کھیلنے کو معیوب سمجھتا ہے یا نبیذ پینے اور محفلِ سماع میں شرکت کو بُرا جانتا ہے، لیکن جب تک یہ حرکت اس کے کسی مخالف یا دشمن سے سرزد ہوتی ہو۔ اس کی پکڑ شدّت اختیار کرلے گی اور اس کے لیے وہ عقوبت اور سزا کا جویا ہوگا، لیکن یہی حرکت اگر اس کے کسی دوست یا صاحبِ وجاہت شخص سے سرزد ہو تو اس کی زبان گنگ ہوجائیگی، اور وہ کہے گا، یہ فعل تو مُجتہَد فیہ ہے[۱] ـــــ امام ابن تیمیہؒ یہ مثالیں دے کر ایسے طرزِ عمل کو قطعاً ناجائز سمجھتے ہیں اور اس طریقہ سے حلال و حرام کرنے کو دین اور شرع شریف کے ساتھ مذاق قرار دیتے ہیں۔

اسی قسم کے لوگوں کے بارے میں امام صاحبؒ فرماتے ہیں:

"وہ بلا شبہ اگر کسی فقہی مذہب کا التزام یا اس سے خروج، بغیر کسی امرِ دینی کے ہو ـــ مثلاً کسی فقہی مذہب کو مال و جاہ، یا کسی دنیوی غرض کے حصول کے لیے اختیار کرلے جسے وہ دل میں اچھا نہ سمجھتا ہو بلکہ بُرا سمجھتا ہو، ـــــ وہ اس شخص کے مانند ہے، جس نے

---

[۱] فتاویٰ ابن تیمیہؒ ص ۲۰، ج ۲۔ (ع۔ ح)

کسی دنیوی مقصد کے ماتحت اسلام قبول کر لیا ہو یا جس نے مکّہ سے مدینہ کی طرف ہجرت تو کی ہو، لیکن اس لیے کہ کسی مرغوب عورت سے شادی کرے یا کوئی اور فائدہ پہنچ جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں ایک شخص نے مکّہ سے ہجرت اس لیے کی کہ اس کی شادی ایک عورت ام قیس سے ہو جائے، چنانچہ اس کا نام ہی "مہاجر ام قیس" پڑ گیا تھا۔ ایک حدیث صحیح کے مطابق رسول اللہؐ نے برسر منبر فرمایا: انما الاعمال بالنیات و انما لکل امرئ ما نوی، فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ و رسولہ، ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او امرأۃ یتزوجھا، فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ (صحیحین)، یعنی اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ جس شخص کی جیسی نیت ہو گی، اسے ویسا ہی پھل ملے گا، جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف ہجرت کی، اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے مانی جائے گی، جس نے اس لیے ہجرت کی کہ دنیا حاصل کرے، یا کسی عورت سے شادی کر لے، تو اس کی ہجرت اسی مقصد کے ماتحت مانی جائے گی[1]

## صحیح حدیث کی وجہ سے ترکِ مذہب

امام ابن تیمیہؒ کے نزدیک حدیث نبوی کے پیش نظر کوئی بھی فقہی مذہب ترک کیا جا سکتا ہے۔ یہ جائز نہیں کہ حدیث صحیح کے ہوتے ہوتے کسی مذہبِ فقہی سے وابستگی قائم رکھی جائے، جس شخص کو کسی حدیث کی صحت کا یقین ہو جائے، اس کے لیے اس کا قبول کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (النساء-۶) یعنی "اگر کسی معاملے میں تمہارا آپس میں نزاع ہو جائے تو اس کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے کراؤ۔ اگر تم خدا و آخرت پر ایمان رکھتے ہو"

پس کسی شخص پر قولِ رسولؐ کے سوا، کسی فقہی مذہب کا التزام واجب و لازم نہیں۔

اور عہدِ صحابہؓ سے لیکر ائمہ مجتہدین کے دور تک سلفِ صالح کا یہ مسلک رہا ہے کہ قولِ رسولؐ کے سامنے وہ کسی کے قول کی پرواہ نہیں کرتے تھے، چنانچہ متعہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ابنِ عباسؓ سے جب بعض حضرات نے گفتگو کی تو انہوں نے فرمایا "ایسے لوگوں پر آسمان سے پتھر کیوں نہیں برستے؟ میں تم سے کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہے اور

---

[1] الفتاویٰ، ج ۲، ص ۲۰۱

تم کہتے ہو کہ ابوبکرؓ و عمرؓ نے ایسا کہا ہے؟[1]

خود ائمۂ اربعہؒ لوگوں کو اپنی تقلید سے منع فرمایا کرتے تھے۔ اگر ان کے قول کے خلاف کسی کو کوئی حدیث مل جائے۔

امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد رشید امام ابو یوسفؒ بعض مسائل میں اپنے استاذ کے ہم نوا تھے، لیکن حج کے موقعہ پر جب امام مالکؒ سے ان کو سنت پر اطلاع ہوئی تو اپنے استاذ کے مذہب سے انہوں نے رجوع کر لیا، اور امام صاحبؒ سے کہا:

"ابو عبد اللہ! میں نے تمہارے قول کے مطابق رجوع کر لیا، اور اگر میرے استاذ ہوتے تو وہ بھی میری طرح اپنے قول سے رجعت کر لیتے!"

امام مالکؒ فرمایا کرتے تھے:

"میں ایک بشر ہوں، میری بات صحیح بھی ہو سکتی ہے، اور غلط بھی، پس میرے قول کو، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے پرکھ لو"

امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے:

"اگر میرے قول کے مقابلے میں صحیح حدیث مل جائے تو میرے قول کو بے تامل دیوار پر دے مارو"

امام احمد بن حنبلؒ فرمایا کرتے تھے:

"اپنے دین کے معاملہ میں رجال کی پیروی نہ کرو، ان سے بھی غلطی سرزد ہو سکتی ہے، پس جس نے حدیث صحیح ترک کر دی، اور رجال کا قول لے لیا، تو اس نے وہ چیز ترک کر دی جس میں غلطی کا احتمال ہی نہیں، اور وہ چیز لے لی جو غلط ہو سکتی ہے۔"[2]

**حدیث رسولؐ ترک نہیں کی جا سکتی** جو شخص استدلال کی قدرت رکھتا ہو اس کے لیے ہرگز یہ جائز نہیں ہے کہ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ترک کر دے، اور کسی امام کا قول اختیار کر لے۔ خواہ وہ امام کتنا ہی بڑا اور صاحب منزلت کیوں نہ ہو، کیونکہ وہ ایسے قول کو ترک کرتا ہے جو لازمی طور پر حجت ہے۔ اور جس کا قبول کرنا لازم ہے، اور وہ قول قبول کر لیتا ہے جو کسی طرح بھی حجت نہیں ہے۔ اقوالِ ائمۂ فقہ تو رد کیے جا سکتے ہیں لیکن قولِ رسول تو رد نہیں کیا جا سکتا، البتہ کسی دوسری حدیث کی صورت میں قابلِ معارضہ ضرور ہے، لیکن اگر معارضہ نہ ثابت ہو

---

[1] الفتاوی ج ۲ ص ۳۸۶   [2] فتاوی ص ۳۸۴ - ج ۲   (ع - ح)

تو پھر اصل کو قبول کر لینا چاہیے، اور جو شخص کسی امام کے قول کی بنیاد پر حدیث صحیح ترک کر دیتا ہے، وہ اصل کو فرع بنا دیتا ہے اور فرع کو اصل، یعنی قول امام کو اصل اور قول رسولؐ کو فرع، اور یہ بات ان لوگوں (عیسائیوں) کے عمل سے مشابہت رکھتی ہے، جنہوں نے اپنے احبار اور رہبان کو خدا کے سوا معبود بنا رکھا ہے، جن کے قول کو وہ دین کے معاملہ میں آخری سمجھتے ہیں اور اس کی کوشش نہیں کرتے کہ دین کا عرفان اس کے اصولوں سے حاصل کریں۔

### اجتہاد قابلِ تجزی ہے

یہاں پر ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسے شخص کے سامنے جو اہلِ استدلال سے نہیں اور کسی امام سے وابستہ ہے، ایسی صحیح حدیث آجاتی ہے کہ اس کے امام کا قول اس کے معارض پڑتا ہے تو کیا اس کے لیے اس بات کی گنجائش ہے کہ حدیث کو صحیح مان کر ترک کر دے اور امام کے قول پر جما رہے؟ امام ابن تیمیہؒ کا موقف یہ ہے کہ ایسا کرنا جائز نہیں، کیونکہ جس مسئلہ میں کسی شخص کو دلیل کی سمجھ آجاتے، وہ اس مسئلہ میں مجتہد ہے۔ اجتہاد اپنی شرائط کے ساتھ قابلِ تجزی و انقسام ہے، ہر شخص اپنے علم و فہم کے مطابق مجتہد ہو سکتا ہے[1]

### تعارضِ احادیث اور معارضۂ قول و حدیث میں درست طریقہ

جو شخص کسی حدیث کو صحیح سمجھتا ہو اور اس کے مطلب و معنی کا فہم مستقیم رکھتا ہو، تو ابن تیمیہ کہتے ہیں کسی حالت میں بھی اسکو حدیث ترک نہیں کرنی چاہیے؛ بجز اس صورت کے کہ کوئی معارض حدیث اس کے علم میں آجاتے اور ثابت ہو جاتے کہ یہ حدیث پہلی سے زیادہ قوی ہے یا پہلی کا نسخ ثابت ہو جاتے، اس صورت میں وہ پہلی حدیث ترک کر سکتا ہے لیکن اس قسم کا شخص اگر یہ کہنے لگے کہ ممکن ہے میرے امام کے قول کی کوئی دلیل ہو جس کا مجھے علم نہیں ہو سکا (اس بنا پر وہ حدیث کو ترک کر دے) تو اس کو امام ابن تیمیہؒ کا جواب یہ ہے کہ:

> "تمہارے علم و فہم نے جب اس مسئلہ میں قول راجح کی طرف تمہاری رہنمائی کر دی ہے تو تمہیں اسی کی پیروی کرنی چاہیے۔ اور اگر اس کے بعد کبھی تم پر یہ واضح ہو جاتے کہ اس نص کا معارض راجح موجود ہے تو تمہیں اسے لے لینا چاہیے، جیسے ایک مجتہد مستقل اپنے اجتہاد میں تغیر کر لیتا ہے اور حق کی پیروی کرتے ہوتے ایک شخص کا ایک راستہ چھوڑ کر دوسری راستے اختیار کر لینا اس سے بہتر ہے کہ آدمی ایک قول کی پیروی پر بغیر کسی حجت اور دلیل کے ڈٹا رہے[2]"

---

[1] الفتاویٰ ج ۲ ص ۲۰۵ - [2] ایضاً

**مذاہبِ جمہور سے اختلاف**

ابن تیمیہؒ کے اِن دراساتِ فقہیہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ رجال و آرا اور ائمۂ اربعہ کی قدر و منزلت کے بارے میں ان کا مسلک تعصب سے بالکل نادر تھا اور بغیر کسی تعصب اور جانبداری کے انہوں نے ہر فقہی مذہب کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا تھا، گویا انہوں نے صرف اس کو پڑھا اور اسی میں تخصص حاصل کیا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابن تیمیہؒ ہر فقہی مذہب کے دقائق کو اس مذہب کے کبار فقہاء سے زیادہ جانتے اور سمجھتے تھے، جبکہ فقہاء کا عام طور پر یہ حال تھا کہ اپنی اپنی فقہ کے سوا باقیوں کے دروازے اپنے اوپر بند کر لیتے تھے۔ ان کے برعکس امام صاحبؒ کا طریق تحقیق و دراست یہ تھا کہ وہ سارے فقہی مکاتیب کی کماحقہٗ قدر کرتے ہوتے سب کا تقابلی مطالعہ کر کے ہر ایک کی گہرائی تک پہنچتے، نہایت باریک بینی سے متفق اور مختلف فیہ مقامات و مسائل کا تجزیہ اور ادراک کرتے تھے تاہم اس وسعتِ نظری کے باوصف ان کا میلان اگر مذہبِ احمد بن حنبلؒ کی طرف ہے تو اس کی وجہ تعصب نہیں بلکہ یہ کہ ان دراساتِ واسعہ سے ان کو امام احمدؒ کا مذہب اس امر میں ممتاز نظر آیا کہ وہ حدیث پاک کے قریب ہے اور اس میں آثار کی تحری و تلاش زیادہ ہے۔

لیکن مذاہبِ ائمۂ اربعہ اور مذاہبِ تابعین کے عمیق مطالعہ نے انہیں اس منزل پر پہنچا دیا تھا کہ کہیں کہیں وہ ائمۂ اربعہ اور مذاہبِ جمہور سے ظواہرِ قرآن اور حدیثِ صحیح کی تائید میں اختلاف بھی کرتے ہیں۔

لہٰذا ہم امام ابن تیمیہؒ کے دراساتِ فقہیہ کو چار اقسام میں تقسیم کرتے ہیں:

(۱) امام ابن تیمیہؒ کے وہ فتوے جو مسائل مختلفہ میں انہوں نے امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب کی پابندی کرتے ہوتے دیئے۔

(۲) وہ مسائل جن میں امام ابن تیمیہؒ کے فکر و اجتہاد نے دوسرے فقہی مذاہب سے ہم آہنگی کا ثبوت دیا۔

(۳) مذاہبِ اربعہ سے امام ابن تیمیہؒ کے مختارات، یعنی امام صاحبؒ کے وہ فتوے اور افکار و آرا، جو کسی خاص فقہی مذہب کے پابند نہیں، اگرچہ انہوں نے ان مختارات میں بھی سنت کا دامن نہیں چھوڑا۔

(۴) امام ابن تیمیہؒ کے وہ اجتہادات جو مذاہبِ اہل السنت والجماعت کے قیود سے یکسر آزاد ہیں، بلکہ ان کی مخالفت پر مبنی ہیں۔

اب ہم چاروں قسموں پر الگ الگ باب میں گفتگو کریں گے!

# (۵۳)

# امام ابن تیمیہؒ کا فقہی پایہ

سابقہ مباحث میں امام ابن تیمیہؒ کی فقاہت کا اجمالی ذکر ہم نے کیا ہے جس کا ایک حصہ عام دینی مسائل میں عوام کی رہنمائی کرنے کا ہے۔ کچھ نمونے فقہی مذاہب کے تقابل و موازنے کے ہیں جس میں بعض کا تعلق لوگوں کے عام معاملاتِ زندگی سے ہے بعض کا نظام سیاسی سے اور بعض کا انتظام شہریت اور دفعِ مظالم سے۔ پھر ہر ایک کی چیدہ مثالوں سے وضاحت کردی گئی ہے تاکہ آپ کی ممتاز فقہی شخصیت کی ٹھوس تحقیقات کا اندازہ ہو سکے۔ آخر میں ان کے اختیاراتِ علمیہ کا ذکر کیا گیا ہے جن میں انہوں نے مذاہبِ اسلامیہ کے اندر سے ہر وہ چیز اخذ کرلی جس میں نبوت کی روشنی یا آثارِ سلف کی جھلک نظر آئی۔ بعض اجتہادات میں ان کی شانِ عبقریت ابھری ہوئی دکھائی دے رہی ہے جن میں وہ اس بات کے درپے ہوتے ہیں کہ اپنا مسلک سلف سے ثابت کریں۔ متقدمین اس کے قائل ہوں یا ان کی آراء پر وہ مبنی یا ان کے اقوال پر مخرج ہو، غرض کہ اپنے فتاویٰ کو مذاہبِ اربعہ یا ان میں کسی ایک سے قریب رکھنے کی پوری کوشش کرتے اور سلفِ صالح ہی کو اپنی تحقیقات کا محور و مرکز بناتے ہیں اور اسلاف کرام سے سرِ مو تجاوز نہیں کرتے، یہی ان کا وہ منہاج عام ہے جس کا اوپر کسی جگہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔

خصوصیت کے ساتھ مسائل طلاق میں امام صاحبؒ نے اپنے نظریات کو فقہ ائمہ اربعہ پر منطبق کرنے کی بہت کوشش کی ہے —— اس کا کیا باعث ہے؟ میری رائے میں اس کے دو سبب ہیں:۔

پہلا سبب جس کا تعلق ان کے ورع و تقویٰ سے ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف ان کے سامنے اصحاب مذاہب اربعہ کی عظیم شخصیتیں اور اسلام میں ان کی فقہی خدمات تھیں، دوسری طرف نصوصِ شرعیہ، آثارِ سلف، اجتماعی مصالح اور مروجہ طلاقوں کے باعث پیدا ہونے والے مفاسد تھے جو تقاضا کر رہے تھے کہ ایک مجلس کی تین طلاق کو ایک اور طلاق حلفی کو لاشئ قرار دیا جائے۔ اِدھر تدین و تقویٰ انہیں مجبور کر رہا تھا کہ بظاہر فتوائے شاذ سے احتراز کریں۔ اب دو ہی راستے تھے، یا تو نصوص و آثار کے مطابق فتویٰ دے دیں یا پھر الزامِ ندرت و شذوذ کے ڈر سے اس سے رُک جائیں۔ چنانچہ اس کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ رواج یافتہ فتووں کے مخالف فتوائے تحقیق کی عمومی اصول و اقوالِ ائمہ سے مطابقت پیدا کر کے اس کی اجنبیت اور اعجوبگی دُور کی جائے، جیسا کہ امام مالکؒ سے اسی قسم کا طرزِ عمل منقول ہے جن کو مصالح امت کے پیشِ نگاہ رکھنے میں پیش روی کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ سامنے آنے والے مسائل میں اہلِ کوفہ کا نقطۂ نظر بھی معلوم کرنا چاہتے تھے، تا کہ اپنے فتاویٰ کی تائید حاصل کی جا سکے۔ چنانچہ ایک دفعہ امام مالکؒ کو معلوم ہوا کہ امام ابو حنیفہ کے صاحبزادے حمادؒ ان کی مجلسِ درس میں موجود ہیں، ان کو بلایا اور چند مسائل کے بارے میں ان کے والد صاحب کی رائیں معلوم کیں۔[1]

دوسرا سبب لوگوں کے توحش کو دُور کرنا تھا۔ اس لیے کہ اگرچہ امام صاحبؒ کے ان فتاویٰ میں عوام کی مشکلات کا حل اور اپنی عائد کردہ پابندیوں سے ان کو نجات دلانا تھا، تاہم وہ بدکتے تھے، امام صاحبؒ اس اندازِ تحقیق سے چاہتے تھے کہ ان کی نفرت دُور کی جائے۔

**مجتہدانہ فقہ**

فقہ ابن تیمیہؒ کا اگر نگاہِ غائر سے مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان کی فقہ تمام تر مجتہدانہ ہے اور حنفیت، شافعیت، مالکیت اور حنبلیت وغیرہ کی گراں باریوں سے یکسر آزاد، بغیر دلیل اور برہان کے وہ نہ کسی کی پیروی کرتے ہیں نہ تقلید، اپنے فتووں میں وہ صاحبِ "اختیار" و استنباط نظر آتے ہیں، جیسا کہ ان کے مختارات کا عام دستور رہا ہے۔ ان کے فتاویٰ اور مختارات میں فرق یہ ہے کہ اپنے اختیارات میں وہ کسی خاص فقہی مذہب کے پابند نہیں رہتے، اور اپنے فتاویٰ میں بڑی حد تک وہ مذہبِ حنبلی کے حدود و قیود کا پاس و لحاظ رکھتے ہیں۔ ان کے مقارناتِ فقہیہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے معلومات بہت وسیع ہیں، ان میں ملکۂ استنباط بدرجۂ اتم موجود ہے۔ قیاس اور مصادرِ شریعت سے وہ اچھی طرح آشنا

---

[1] قصہ کی تفصیل مصنف کی کتاب مالک، حیاتہ و عصرہ، آراءہ و فقہہ ص ۱۱۲ میں ہے۔ (ع-ح)

ہیں، معانیِ آثار کی تحقیق وہ اس طرح کرتے ہیں کہ مصلحتِ عوام مجروح نہ ہو، لوگوں پر خواہ مخواہ کا بوجھ نہ پڑے، اپنے اجتہاد میں وہ کتاب و سنت، منہاج سلف صالح، اور منہاج ائمہ مجتہدین کو پورا پورا ملحوظ رکھتے ہیں۔

**مجتہدات ابن تیمیہؒ کی کیفیت** لیکن اس کے باوجود کہ امام صاحبؒ فقیہ مجتہد ہیں، مقلد ہرگز نہیں جو ہر حالت میں اپنے فقہی مذہب کا لحاظ کرتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ چند ہی مسائل میں امام صاحبؒ مذاہبِ اربعہ سے منفرد نظر آتے ہیں جیسے طلاق حلفی اور طلاق بدعی کے بارے میں یا یہ کہ کتنی مسافت کے سفر پر روزہ کا افطار اور نماز کا قصر کرنا مشروع ہے یا بہ ضرورت[1] بغیر سفر کے بھی جمع بین الصلاتین کرنے (دو وقت کی نمازیں یکجا کرنے) کی رخصت۔

ایسی خالص انفرادیت کی مثالیں کم ہیں جن میں وہ کسی فقہی مذہب سے بھی ہم آہنگ نہ ہوں، تاہم ان مجتہدات و مختارات کی کیفیت یہ ہے کہ اگر وہ فقہ کے مذاہبِ اربعہ سے ہم آہنگ نہیں ہیں تو بھی کسی دوسرے مسلک، مثلاً ظاہریہ وغیرہ سے مطابق ہیں، لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ ایسے مسائل جن میں وہ بالکل منفرد ہوں نادر ہیں، عام طور پر ان کا معمول یہ ہے کہ وہ دو رایوں میں درمیانی راہ پسند کرتے ہیں یا دو نقطہ ہائے نظر کے درمیان جمع و تطبیق کر دیتے ہیں۔ نیز یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ان کا اجتہاد، ائمہ فقہ و حدیث کے مقرر کیے ہوئے اصولوں سے منحرف نہیں ہوتا، خاص طور پر فقہ حنبلی کے اصولوں کی تو وہ حتی الامکان بہت پابندی کرتے ہیں، کیونکہ اس فقہ کی تدوین و تہذیب میں ان کا اور ان کے خاندان کا بڑا حصّہ رہا ہے۔

امام صاحبؒ کی ان مساعی اور تحقیقات کو دیکھتے ہوئے فقیہانہ اصطلاح کے اعتبار سے جو مرتبۂ اجتہاد چاہیے ان کو دے دیجیے، لیکن ان کا فقہی رتبہ بہت بلند ہے۔ فقہ، اصولِ فقہ اور مصادرِ فقہ سے ممارست کے باعث ان کا اجتہادی ملکۂ خاص، اسلاف سے میراث میں آئی ہوئی ثروتِ فقہیہ کا تقابل و موازنہ، سلف سے خلف تک کے فیصلوں اور فتاویٰ پر وسیع و عمیق نظر، یہ ایسے امور ہیں جن کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

بلاشبہ ادواتِ اجتہاد اور مدارکِ فقہیہ کے اعتبار سے نیز سنت، لغت، تفسیر اور فہمِ قرآن

---

[1] مثلاً شدید بارش کے موقع پر (ع۔ ح)

کے علم کے اعتبار سے، علاوہ ازیں اصولِ سنت اور حدیث کی روایت و درایت پر مکمل دسترس کی حیثیت سے وہ اس کے مستحق ہیں کہ انہیں اجتہادِ مطلق کے درجہ پر رکھا جائے، اگر صرف انہی خصائص پر ہم نظر رکھیں تو بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ مستقل درجۂ امتیاز پر فائز تھے، لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اپنے استنباط میں وہ زیادہ تر امام احمدؒ کے مسلک پر چلتے اور ان کے اصولوں کی پابندی کرتے ہیں، ساتھ ہی اس بات کو بھی سامنے رکھا جائے کہ جن مسائل میں وہ بالکل منفرد ہیں ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے تو انہیں مذہبِ حنبلی کے مجتہدین میں شمار کرنا چاہیے، اگرچہ نتائج پیدا کرنے میں وہ مجتہد مستقل کے مرتبہ پر فائز نظر آتے ہیں۔ تاہم منہاجِ استدلال و استنباط میں حنبلیت سے باہر نہیں جاتے۔

### عہدِ ابن تیمیہؒ کی توسیع شدہ فقہ

ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ جب امام صاحبؒ میں اجتہاد کے تمام شرائط پائے جاتے تھے اور تفسیر، سنت، اور استنباط پر انہیں پورا پورا عبور حاصل تھا، پھر ان کی انفرادیت اتنی کم اور ان کے نوادرات اس درجہ مختصر کیوں ہیں؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں تاریخ کے اوراق الٹنا پڑیں گے، نیز اُفقِ استنباط کے پھیلاؤ کو دیکھنا ہوگا۔

ابن تیمیہؒ کا دور وہ ہے کہ فقہ میں وسعت پیدا ہو چکی تھی، فتاویٰ بکثرت وجود میں آ رہے تھے اور تخریج کا دروازہ پوری طرح کھلا ہوا تھا، امام صاحبؒ جب نمودار ہوئے یعنی ساتویں صدی ہجری کا آخری اور آٹھویں صدی ہجری کا ابتدائی دور، اس وقت اگلوں نے پچھلوں کے لیے کام کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ چنانچہ ائمہ اربعہ کی فقہ مدوّن ہو چکی تھی، اس طرح فقہ ظاہری، اور فقہ شیعی کی تدوین بھی ہو چکی تھی۔ فقہ اباضیہ (خوارج) بھی اتمام کو پہنچ چکی تھی۔ ہر فرقے میں اصحابِ اجتہاد اور اصحابِ تخریج کثرت سے ہو چکے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے اپنے امام کے اصول و اقوال کی بنیاد پر پیش آمدہ واقعات میں حسبِ ضرورت اجتہاد و تخریج سے بھی کام لیا تھا۔ ان حضرات نے واقع شدہ حوادث ہی پر نہیں بلکہ حوادثِ غیر واقع پر بھی فتوے دیئے تھے، یعنی عقلی طور پر جس کے وقوع کا امکان بھی ہو اس پر فتویٰ دے دیا کرتے تھے، بلکہ چوتھی سے چھٹی صدی ہجری تک تو حال یہ تھا کہ جو باتیں ممکن الوقوع نہ ہوں، ان کے بارے میں یہ سمجھ کر فتویٰ دے دیتے تھے کہ ان میں لوگ مبتلا ہو چکے ہیں۔ اس طرح فقہ تقدیری (فرضی معاملات) کا افق کافی وسیع ہو گیا تھا۔ پہلے ان کا فتویٰ ان واقعات پر ہوتا تھا جو درحقیقت اپنا کوئی وجود رکھتے تھے،

پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ خیالی اور غیر واقعی باتوں پر فتوے دیئے جانے لگے[۱]

### بدلتے ہوئے حالات میں فقہ اسلامی کی کامیاب رہنمائی

پھر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جن واقعات و حوادث پر فتوے دیئے جاتے تھے وہ بہت زیادہ مختلف نوعیت کے تھے۔ اختلافِ زماں اور اختلافِ عُرف نے ان کے تنوّع میں اضافہ کر دیا تھا، بلادِ اسلامیہ کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ مشرق میں چین سے لے کر مغرب میں جنوبی یورپ بلکہ وسطی یورپ تک پھیلے ہوئے تھے، ان میں سے ہر اقلیم کے اپنے حوادث تھے، ہر شہر کے مخصوص عادات تھے، ہر دیار کا جداگانہ عرف تھا، علمائے کرام نے اپنے اپنے مذاہب کے مطابق استنباط و استخراج کیا اور فتوے دیئے۔ عصر ابن تیمیہؒ میں شاذ ہی کوئی واقعہ ہوگا کہ ماوراء النہر، یا عراق، یا خراسان یا فارس، یا مصر و شام یا مغرب اقصیٰ یا اندلس وغیرہ میں اسی کا مثل رونما نہ ہو چکا ہو، چنانچہ جو فتاویٰ مرتّب ہوئے، وہ فقہ کے انہی مذاہبِ اسلامیہ کے مطابق تھے۔

### فقہ اسلامی جامد نہیں

اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ ان مذاہب کی اتباع کرنے والے علماء جامد تھے، وہ غلطی کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان حضرات نے مذہب کی تجدید و احیا کا کارنامہ ہر دور میں انجام دیا، ان لوگوں نے واقعاتِ پیش آمدہ پر جو فتوے دیئے وہ حال و مآل کے عین مطابق تھے، کبھی کبھی انہوں نے اپنے ائمہ سے اختلاف بھی کیا، مگر یہ اختلاف خود ان کے بقول دلیل و برہان کا اختلاف نہ تھا، بلکہ وقت اور زمانہ کا اختلاف تھا، یعنی اگر وہ امام ہمارے زمانہ میں موجود ہوتا تو وہ بھی ہمارے ہی ایسا فتویٰ دیتا، کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ علماء مالکیہ اور شافعیہ نے چوتھی صدی ہجری میں میراث ذوی الارحام کا جو فتویٰ دیا[۲] وہ حنابلہ کے طریقہ پر تھا اور اپنے امام یعنی مالکؒ و شافعیؒ سے اختلاف کیا، مخالفت کی وجہ ان کے زمانہ میں نظامِ بیت المال کا بگاڑ تھا، کیونکہ وہ حق داروں کو ان کا حق نہیں دیتا تھا، لہٰذا ان علماء نے مطابقِ حال فتویٰ دیا، اور اپنے دونوں جلیل القدر اماموں سے جو منصوص تھا اس کی پابندی نہیں کی، کیونکہ وہ جانتے تھے اگر یہ دونوں امام ــــ مالکؒ و شافعیؒ ــــ ان کے زمانہ میں موجود ہوتے تو وہی فتویٰ دیتے جو

---

۱۔ "فقہ تقدیری" کی بابت امام احمدؒ اور دوسرے اہلِ حدیث کی آراء کے لیے دیکھیے حیات امام احمد بن حنبلؒ ص ۴۶۸-۴۷۰۔

۲۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے (عقد الجید فی الاجتہاد والتقلید ص ۴۹) (ع-س)

انہوں نے دیا ہے اور اسی مسلک کو اختیار کرنے جو حدیث و اثر سے قریب تر تھا، اور وہ امام احمدؒ کا مسلک تھا۔

**فقہی ذخیرہ سے استفادہ**

ابن تیمیہؒ جب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے، تو اقوالِ کثیرہ کا ایک انبار ان کے سامنے تھا، سارے فقہی مذاہب کے فتاوائے مختلفہ ان کی نظر میں تھے، یعنی مذاہب اربعہ کے علاوہ شیعۂ امامیہ، زیدیہ، ظاہریہ اور اباضیہ (خوارج) کے مذاہب، ان میں سے ہر مذہب بجائے خود مناہجِ مختلفہ کا مجموعہ تھا، پھر کیا ضرورت تھی کہ کوئی ایسی نئی بات کہی جائے، جو پہلے کسی نے بھی نہ کہی ہو یا مذکورہ مذاہب میں سے کسی مذہب میں بھی موجود نہ ہو، لہٰذا جب کہ اگلوں کے ذخیرے میں پچھلوں کے لیے حق و صواب کی بات کہیں نہ کہیں موجود ہے تو یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے کہ ابن تیمیہؒ کے اجتہادات کی نظیر و مثال فقہ شیعہ یا فقہ ظاہریہ وغیرہ میں مل جاتی ہے، جیسا طلاق ثلاث کے سلسلہ میں گزر چکا ہے[۱]۔ البتہ یہ بات ضرور تعجب خیز ہوتی اگر امام صاحبؒ کا کوئی قول ایسا ہوتا کہ اختلافِ مناہج و انظار اور حوادث و امصار کے باوجود سابقین میں سے کسی کے ہاں نہ ملے۔

**مناہج ائمہ کی متابعت**

اس سلسلے میں بھی امام صاحبؒ ائمہ اربعہ وغیرہ کے طریقہ پہ گامزن ہیں۔ ان کی فقہ اور اتفاقی و اختلافی مسائل کو غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی کا قول بھی ایسا منفرد نہیں جس کی کوئی نظیر دوسرے کسی مذہب یا قول میں موجود نہ ہو۔ مثال کے طور پر امام ابوحنیفہؒ ہیں، ان کا شاذ و نادر ہی کوئی ایسا قول ہوگا جو باقی ائمہ کے کلیۃً مخالف ہو۔ اگر کسی کا قول باقی تین اماموں سے الگ ہو بھی تو چاروں سے باہر کسی امام کے مذہب و قول میں اس کی نظیر و شبیہ ضرور موجود ہوگی۔ بات یہ ہے کہ سلفِ صالح میں اخذ و اقتباس کا سلسلہ جاری تھا اور اس سے نہ تو ان کی اجتہاد و استنباط کی اقدار پر کچھ اثر پڑتا ہے، نہ ہی اس عظمت پر کہ ان کی مساعی سے فقہ اسلامی کا وہ چشمۂ صافی جاری ہوا جس سے بعد کے لوگ خوب خوب سیراب ہو رہے ہیں۔

فتاویٰ میں ندرت و شذوذ سے بھی ائمہ کرامؒ بچتے تھے جس کی وجہ ان کا تدیّن میں تصلّب اور

---

۱؎ مل جانا اور بات ہے، کیونکہ توارد مستبعد نہیں۔ مگر طلاقِ ثلاثہ وغیرہ مسائل میں امام صاحبؒ پر شیعی مذہب کا کوئی اثر نہیں۔ تفصیلی گفتگو اوپر گزر چکی ہے۔ (ع-ح)

ایمانی قوت تھی، وہ ناپسند کرتے تھے کہ فقیہ ایسی بات کرے جس میں وہ بالکل منفرد ہو۔ لہذا امام ابن تیمیہؒ اگر فتاویٰ میں سلفِ امت کے اقوال سے بلا امتیاز استفادہ کرتے ہیں اور ورع و تدینؒ کی وجہ سے انفرادیت و تنذوذ سے بچتے ہیں تو اس سے ان کی مجتہد ہونے کی حیثیت پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

**حنابلہ میں وسعتِ اجتہاد**

لیکن اگر کہا جائے کہ امام صاحبؒ کے فتاویٰ و اختیارات اور مباحثِ فقہی صاف طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ اصول و آراء اور دراسات میں وہ حنبلی ہیں، اگر کسی جزئی میں حنبلی مذہب کے خلاف بھی کرتے ہیں تو حنبلی اصول ہی کی روشنی میں کرتے ہیں اور اپنے مسلک پر اصولِ حنبلیہ کو منطبق کر کے دکھاتے ہیں، وہ مذہبِ حنبلی میں کوئی نہ کوئی نظیر و شبیہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ غرض ان کے اس شغف سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اول و آخر حنبلی ہیں۔

اس کے جواب میں گزارش ہے کہ یہ درست ہے حنبلیت ان سے الگ نہیں ہوتی، لیکن اس کی ایک بڑی اہم وجہ ہے اور وہ یہ کہ حنبلی مذہب میں وسعت پذیری زیادہ ہے جس کی وجہ اس میں اجتہاد کی کثرت ہے۔ اکثر حنبلی علماء کا یہ کہنا ہے کہ کسی دور کا مجتہد مطلق سے خالی رہنا درست نہیں[1]۔ ان میں اجتہاد کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوا۔ وہ ہر فقیہ محقق کو حق دیتے ہیں کہ غیر منقول مسائل میں امام احمدؒ کے اصول و منہاج پر اجتہاد کرے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ حنابلہ کا دور مجتہدین سے خالی نہیں رہا۔ تا آنکہ امام ابنِ تیمیہؒ اجتہاد کو اونچی سطح پر لے گئے۔

اس نوع کے علمائے حنابلہ کی مجتہدانہ کاوشوں کی وجہ سے فقہ حنبلی مالا مال ہو گئی۔ اس میں کثرتِ اقوال کی وجہ بھی یہی ہے، بعض دفعہ ایک مسئلہ میں چار چار قول مل جاتے ہیں جو ہر ایک امام احمدؒ کی طرف منسوب ہوتا ہے، کیونکہ مجتہدانہ گہرائی سے ہر قول کی تخریج اقوال و اصولِ احمدؒ پر ہوتی ہے۔ اس قسم کی آراء علماء کو فقہی اصطلاح میں "وجوہ" کہا جاتا ہے جس کی مناسب تفصیل اس عبارت سے معلوم ہو سکتی ہے:

اعلم ان الصحیح من المذهب ان ما قیس علی کلامه (ای احمد) مذهب له وهذا رأی الاثرم والخرقی وغیرهما من المتقدمین وقاله ابن حامد وغیره فی الرعایتین وآداب المفتی والحاوی وغیرهم وقیل لیس بمذهب له قال ابن حامد عامة مشائخنا مثل الخلال وابی بکر بن عبد العزیز وابی علی وابراهیم وسائر

---

[1] ارشاد الفحول ص ۲۳۶ والمدخل ص ۱۹۲-۱۹۳ - (ع، ح)

من شاھدنا ھم لا یجوزون نسبتہ الیہ وانکروا علی الخرقی مارسمہ فی کتابہ من حیث انہ قاس علی قولہ وقال فی الرعایۃ الکبری ان نص الامام علی علتہ اوامَا الیھا والافلا الاان تکون اقوالہ اوافعالہ اواحوالہ مشیرۃ للعلۃ المستنبطۃ بالصحۃ والتعیین . . . وقال الموفق فی الروضۃ والطوفی فی المختصر ان بین العلۃ فمذھبہ فی کل مسئلۃ وجدت فیھا العلۃ کمذھبہ فیما نص علیہ وان لم یبین العلۃ فلا وان اشبھتھا اذھو اثبات مذھب بالقیاس ولجواز ظھور الفرق لہ لوعرضت علیہ[1]۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ حنابلہ کے ہاں امام احمدؒ کے اصول پر جو قول مخرج ہو وہ مذہب حنبلی کا شمار ہوتا ہے۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ اس میں ہے کہ امام احمدؒ کی طرف اس کی نسبت کی جاسکتی ہے یا نہیں۔ خیر جو بات بھی ہو اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کثرتِ اجتہاد کے باعث حنبلی مذہب نمو پذیر اور شاداب ہے۔

## ابن تیمیہؒ کے اجتہاد کی نوعیت

اس چشمۂ شاداب سے امام ابن تیمیہؒ خوب خوب متمتع ہوئے۔ وہ استنباطِ مسائل میں عام طور پر منہاجِ احمدؒ پر چلتے تھے، چنانچہ اپنی تحقیق و تدقیق کے بعد وہ جن نتائج تک پہنچے ہیں، وہ اکثر امام احمدؒ کے مسلک سے مطابقت رکھتے ہیں۔ چند ہی مسائل ہیں، دوسرے ائمہ سے انہوں نے ہم آہنگی اختیار کی ہے، پھر وہ مسائل اور بھی کم ہیں جن میں امام صاحبؒ بالکل منفرد ہیں۔ لیکن ان سب میں وہ ایسے مجتہد ہیں جو بغیر دلیل کے ایک قدم آگے نہیں بڑھاتے تھے۔ وہ بغیر ثبوت کے کوئی حکم نہیں لگاتے۔ اگر کسی سے اتفاق کرتے ہیں تو دلیل کی بنا پر، اختلاف کرتے ہیں تو دلیل کو سامنے رکھ کر، تقلیدِ مطلق کی صفت ان کے کسی قول، کسی فتوے، کسی اختیار اور کسی دراست میں نظر نہیں آتے گی۔ ظاہر ہے یہ خصوصیت اجتہاد ہی کی ہے کہ دلیل کی پیروی کی جائے۔

وہ رجال کے تابع نہیں تھے، اگر امام احمدؒ کی موافقت کرتے ہیں تو امام ابوحنیفہؒ کی موافقت کے لیے بھی تیار رہتے ہیں، بشرطیکہ ان کا قیاس زیادہ قوی ہو اور حدیث و اثر کے معارض نہ پڑے۔

---

[1] مقدمہ تصحیح الفروع ص ۵ ج اول۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام ابن تیمیہؒ کے اجتہاد کی نوعیت کیا ہے؟ —— آیا وہ مجتہد مطلق تھے؟ یا کسی خاص مذہب کے مجتہد (مجتہد فی المذہب) تھے؟ یا صرف صاحبِ تخریج تھے؟

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہمیں مراتبِ مجتہدین پر گفتگو کر لینی چاہیے پھر ہم اس مرتبہ پر گفتگو کریں گے، جس پر امام صاحبؒ فائز تھے۔

---